eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

مسافرت کا چاند: جدید عہد کا منظر نامہ

Traveling Moon: A Modern Era Scenario

جہاں گیر تاج

ایم فل اسکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر عدنان طارق

اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

Jahangir Taj

MPhil Scholar, Govt. College University, Lahore

Dr. Adnan Tariq

Assistant Professor, Govt. College University, Lahore

Abstract:

Salim-ur-Rehman is regarded as a reclusive poet, but his collection of ghazals, Musafrat Ka Chand, occupies a prominent place in modern ghazal writing. The travel moon is a metaphor for migration, which is facing a double consciousness in Western countries and its own identity has been destroyed. The problems faced by the modern man have been well highlighted on the intellectual levels. In this collection, Salim-ur-Rehman has discussed New World Order, war, globalization and environmental pollution, which has made his ghazals authentic and meaningful, as if his ghazals are truly the scenario of the modern age, which scribe described in the article under discussion.

Key words: Modernity, Post-Colonial, Globalization, Cultural Amnesia, Double Consciousness, Fragmentation, World Bank, Environmental Pollution, Deforestation

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن سکہ بند نظم نگار ہیں اور اُن کا شمار 1955ء کے لگ بھگ نئی شاعری اور نئی لسانی تشکیلات کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ نئی شاعری کے علم برداروں کے ہاں نظم نگاری کا غالب رجحان ملتا ہے۔یہی سبب ہے کہ ان شعرا نے غزل کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ بیش تر شعرا نے تو غزل کو درخور اعتناء نہ سمجھا، جب کہ بعض شعرا نے محض چند ایک غزلیں کہنے پر ہی اکتفا کیا اور ازاں بعد نظم نگاری کو ہی اظہار کا

وسیلہ بنایا۔ نئی شاعری کی تحریک سے جڑے شاعر اُس وقت ورطہ حیرت میں آ گیے، جب ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی غزلیات کا مجموعہ "مسافرت کا چاند" منظر عام پر آیا۔

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن اِس تحریک سے جڑے وہ واحد شاعر ہیں، جن کا باقاعدہ غزلیات کا مجموعہ شائع ہوا۔ اُن کا مجموعہ "مسافرت کا چاند" اس بات پر دال ہے کہ ایک بڑا فنکار کسی ایک صنف سے ہی نہیں جڑا رہتا، بل کہ وہ دیگر اصناف سخن میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہے۔ "مسافرت کا چاند" میں نو غزلیں ایسی ہیں جو 1960ء کے لگ بھگ کہی گئیں۔ ان میں سے بیشتر سبط حسن کے رسالے "لیل ونہار" میں شائع ہوئیں۔ بعد ازاں ان غزلوں کو "شام کی دہلیز" میں شامل کر دیا گیا۔ ان غزلوں کو پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ دیار غزل سے نا بلد نہیں ہیں۔ مقام حیرت ہے؛ "شام کی دہلیز" میں شامل ان غزلوں پر کسی نقاد نے کوئی آراء نہیں پیش کی۔ حالاں کہ ان غزلیات کو یوں یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرف ارمان نجمی "مسافرت کے چاند" کے دیباچے میں توجہ دلاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "منظر جاگتا سوتا ہوا، میں چند غزلیں بھی شامل ہیں جن کے بارے میں کسی کی رائے شامل نہیں ہے شاید صرف نو غزلیں اور چند متفرق اشعار پر کچھ لکھنا مشکل ہی ہوتا لیکن چند سطور میں کچھ نہ کچھ اشارے تو کیے جا سکتے تھے۔"(1)

1960ء کے بعد انھوں نے شاعری کی طرف کچھ خاص توجہ نہ دی، شاید پیشہ ورانہ مصروفیات آڑے آ گئیں، اس سب کے باوجود بھی وہ وقتاً فوقتاً اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے رہے۔ 1990ء کے بعد انھوں نے شعری تخلیقات پر خاص توجہ دی اور کچھ نئی نظمیں اور غزلیں منظر عام پر آئیں۔ زیر بحث غزلیات کا مجموعہ "مسافرت کا چاند" زیادہ تر 1991ء تا 2009 کے انتخاب پر مبنی ہے۔ اس مجموعے میں شامل غزلوں کی تعداد 67 ہے جس میں نو غزلیں اس سے پہلے "شام کی دہلیز" اور "منظر سوتا جاگتا ہوا" میں شائع ہوئیں تھیں۔

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کے اندر چھپا ہوا احساس انسان ان غزلوں میں موجزن موجود ہے۔ جو عصری حسیت کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مسائل کا مکمل ادراک بھی رکھتا ہے۔ دور جدید کا انسان جن خارجی و باطنی مسائل سے دوچار ہے، اس کا بھرپور مرقع کھینچا گیا ہے۔ گویا اُن کے ہاں عصری حسیت کا ایک بھرپور منظر نامہ موجود ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر انیس ناگی رقم طراز ہیں:۔

> "نئی حساسیت سے مراد سلیم الرحمٰن کے مشاہدے کے اُسلوب اور وہ منظر نامہ ہے جو اُسے ملک سے باہر دوسری سرزمینوں میں دکھائی دیا ہے۔"(2)

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کے اس مجموعہ کا عنوان ہی بہت سی معنوی خوبیاں رکھتا ہے۔"مسافرت کا چاند" ایک ایسے حساس انسان کا مشاہدہ ہے، جو اُسے بیرون ملک قدم قدم پر دامن گیر رہتا ہے۔ ہجرت اُردو شاعری کا ایک خاص اور اہم موضوع رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء کا سانحہ عظیم ہجرت کے ان مٹ نقوش دل و دماغ پر چھوڑ گیا۔ سب بچپن کے سنگی ساتھی بچھڑ گیے اور بہ مجبوری اپنے گھر بار چھوڑ کر نئی سرزمین میں آباد ہو گیے۔ لیکن اس عمل میں کن جان لیوا مصائب کا سامنا ہوا، اس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اُردو ادب کا شاید ہی کوئی ادیب اور شاعر ہو جس نے ان مصائب کی جزئیات نگاری بیان نہ کی ہو۔ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کا یہ بچپن کا زمانہ تھا۔ بارہ برس کے اس بچے نے 1947ء کے واقعات کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان ہنگاموں میں سب دوست دور دیس میں جا بسے۔ خدا جانے اس کے بعد اُن کے ساتھ کیا ہوا، سلامت بھی رہے کہ نہیں ان گہرے صدمات کا اندازہ ان کی نظموں اور غزلوں کو پڑھنے سے بہ خوبی ہوتا ہے۔ لیکن غور طلب بات ہے کہ وہ خود ساختہ مہاجر بھی تو ہیں اور لگ بھگ پچھلی چھ دہائیوں سے برطانیہ میں مقیم ہیں 1947ء کا سانحہ عظیم اور خود ساختہ ہجرت اُن کی شاعری کے پیچھے اہم محرکات ہیں، اس خود ساختہ ہجرت کے بہ موجب وطن سے دور رہنے کا کرب اور والہانہ محبت کا اندازہ اُن کی شاعری سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

"مسافرت کا چاند" کی بیشتر غزلیات میں ہجرت کا ہی مضمون باندھا گیا ہے، اُن کا مشاہدہ بہت گہرا اور کاٹ دار ہے۔ کیوں کہ انھوں نے وطن سے جدائی کے کرب پر ہی اکتفا نہیں کیا بل کہ مغربی ممالک میں در پیش مسائل اور رویوں کو بھی انتہائی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ تیسری دُنیا کے لوگوں کو کبھی بھی مغرب نے فراخ دلی سے قبول نہیں کیا۔ مدتوں اُن کے ساتھ رہنے کے بعد بھی اُن کے رویوں میں کچھ خاص فرق نہیں آیا اور آج بھی تیسری دُنیا کی ہر شے مشکوک لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ہوائیں بھی زہر لگتی ہیں۔

اب میرے دیس سے آنے والی
زہر لگتی ہیں ہوائیں سب کو(3)

ایک عرصہ تک انسان جب بیرون ملک بود و باش اختیار کرتا ہے تو اُس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اُسی ملک کی ثقافت ہوتی ہے۔ وہ ذہنی طور پر تو اُسے اختیار کر لیتا ہے لیکن دلی طور پر اپنے گزشتہ سے پیوستہ ہوتا رہتا ہے۔ فی الحقیقت اُس کی دلی وابستگی اپنے وطن سے ہوتی ہے، جو اُسے ہر لمحہ رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ قلق مزید بڑھتا ہے۔ اس قلق کا سبب شناختی بحران بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ وہ اکثر اس شناخت کی تلاش میں ماضی کے مزاروں پر حاضری دیتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کے ہاں اس صورت میں ہجرت کا پہلو انتہائی تہہ دار اور کربناک ہو جاتا ہے۔ جو اسے اکثر مضطرب و بے چین رکھتا ہے۔"اجنبی سرد آسمان" کی ترکیب در حقیقت اسی کرب کی مظہر ہے، جس سے اجنبی دیس کی سرد مہری اور تنہائی کا کرب اُن کے اشعار میں جھلکتا ہے۔

اجنبی سرد آسماں تھا دھوپ کا ٹکڑا نہ تھا
گھر کے باہر کا اندھیرا گھر میں تھا اُترا ہوا (4)

سالہا سال قربتوں کے بعد
لوگ اس شہر میں پرائے ہیں (5)

ہجرتیں میری مکمل نہ ہوئیں
اب تو رستے کو تھکا دیتا ہوں (6)

کھولتا ہوں کھڑکیاں میں یاد کی
دیکھتا گزرا سماں رہتا ہوں (7)

وہیں پر بس گیے آخر جہاں پر آب و دانہ تھا
کہو تم ہی مسلسل ہجرتوں میں کون رہتا ہے (8)

ارمان نجمی کتاب "مسافرت کا چاند" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

"جدت طرازی (Modernity) ہمیں ایک دائمی کشمکش، تضاد، ابہام اور کرب کے حوالے کر کے مسلسل شکشت وریخت اور یکجائی کے مختتم سلسلے میں مصروف رکھتی ہے۔
اس طرح ہم مکمل تباہی اور بے حساب ترقی، اندوہ، مزاحمت، جنگ کی تیاری اور امن کی کشاکش کے امکان میں گرفتار رہتے ہیں اور ہماری "پس نو آبادیاتی" (Post Colonial) صورت حال معاملے کی سنگینی میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ اور ہم اپنی وطنی یا ملکی ثقافت اور نئی بستیوں کے موصولہ ثقافت کے درمیان بے بس نظر آتے ہیں ۔ رہی سہی کسر گلوبلائزیشن (Globalization) نے پوری کر دی ہے، جو ہمارے ماضی اور مستقبل پر بھی سوال اُٹھاتی

ہے اور اپنے شکار لوگوں کو ثقافتی نسیاں (Cultural amnesia) میں مبتلا کر دیتی ہے۔"(9)

یہی ثقافتی نسیاں (Cultural amnesia) دوغلیت، مضحک نقالی اور دو جذبی رجحانات کا موجب بنتا ہے، جو اس دور کی سب سے بڑی دین ہے۔ انسان اپنے ماضی اور مستقبل کی کش مکش میں اپنے حال پر خود ہی سوال اُٹھاتا ہے، اسی کش مکش میں وہ اپنی اصل شناخت کے تعارف میں کہیں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ ذہنی و جسمانی طور پر وہ شاید مغرب سے جڑ جائے لیکن دلی وابستگی اُس کی مشرق سے ہی ہوتی ہے۔ یہی وہ شعور ہے جو اُسے اپنے ماضی اور حال کے درمیان لا کھڑا کرتا ہے۔ یعنی وہ اک ایسی دُنیا میں رہ رہا ہوتا ہے جس کے ایک دوراہے پر اُس کا ماضی اور دوسرے دوراہے پر حال ہوتا ہے، جب کہ وہ خود کہیں درمیان میں گونا گوں حالت میں ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کی رائے بہت اہم ہے:

"دہرے شعور کا مطلب ہی یہ ہے کہ شعور واحد بھی ہوتا ہے۔ شعور کی وحدت خود کو، دُنیا کو سمجھنے کے ایک ایسے دخلی طور پر متحد نظام معنی سے عبارت ہے، جسے اپنی ثقافت سے اخذ کیا جاتا ہے اور اسی کی مدد سے ثقافت میں اپنی شناخت قائم کی جاتی ہے۔ شعور کی وحدت کی سب سے بڑی عطا اپنی ثقافت سے مثالی نہ سہی قابل عمل ہم آہنگی اور اس کے نتیجے میں اپنے وجود سے متعلق بنیادی سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی اہلیت ہے۔ دُہرے شعور سے وحدت ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی ثقافت سے ہم آہنگی میں ایک بڑی دراڑ پڑ جاتی ہے۔ ایک ایسا زخم وجود کی گہرائیوں میں محسوس ہونے لگتا ہے، جس کا اندمال ہی زندگی کا مقصد عظیم ہو جاتا ہے۔"(10)

اس دُہرے شعور کی وجہ سے وہ اپنی حقیقت کو تلاشتا ہوا خود سے اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ اکثر اپنے مذہبی عقائد، رسم و رواج اور زبان کی بازگشت میں اُلجھتا ہے۔ اس سلسلے میں ارمان نجمی رقم طراز ہے:

"دہرے شعور (Double Consciousness) کی اس تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے تضادات کے مختلف پہلوؤں کی گونج بھی ان اشعار میں سنائی دیتی ہے کہ نقل مکانی کا سلسلہ اپنے ساتھ تہذیب و ثقافت، مذہب و عقیدہ، پیدائش اور موت کے بعد کے رسم و رواج کے اختلاف کو رد اور قبول کرنے کے مسائل سے اُلجھائے رکھتا ہے کہ ذات کے ٹکڑے ٹکڑے

(Fragmentation) ہونے اور شخصیت کو ریختگی (Fracture) سے محفوظ رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔"(11)

اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کا مجموعہ "مسافرت کا چاند" ایسے دُہرے شعور اور ہجرت کے کرب سے بھرا پڑا ہے؛ جہاں ہجرت اور نقل مکانی سے پیدا ہونے والی داخلی اور خارجی صورت حال کی جزئیات نگاری چونکا دینے والی حد تک موجود ہے۔

مسلسل ہجرتوں سے چور ہو کر
مسافر راہ میں سونے لگا ہے
اُمڈ آیا ہے موسم نفرتوں کا
دلوں میں زہر سا بونے لگا ہے(12)

تلوار چل رہی ہے خزاں میں ہواؤں کی
ہر پھول چاک چاک ہے ہر ڈال زخم زخم(13)

اس سلسلے میں بعض غزلیں ہجرت کے تجربے کو مسلسل سموئے ہوئی ہیں۔ جن میں شاعر نے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو تخلیقی عمل سے شعری پیکر میں بہت خوب صورتی سے ڈھالا ہے۔

میں تھک چکا ہوں کر کے ہجرتیں مسلسل
تھیں مسافتیں بھی لمبی مری منزلیں مسلسل
کبھی دُھند دُھند منظر کبھی بارشیں مسلسل
کبھی ظلمتوں کے بادل کبھی ظلمتیں مسلسل
مجھے راہ میں ہزاروں پڑیں مشکلیں مسلسل
جو ملا سکوں تو پل بھر نہ تھیں راحتیں مسلسل
یہاں کیسی زندگی ہے، یہاں کیسی بے بسی ہے
یہاں لوگ جی رہے ہیں لیے حسرتیں مسلسل
کبھی وسعتِ نظر تک پڑے راستے میں صحرا

کہیں اُونچی چوٹیوں پر تھیں رُکاوٹیں مسلسل
یہاں پہلے دن سے ہم نے لہو اپنا ہی بہایا
یہاں آئیں سب کے حصے کیوں ہیں نفرتیں مسلسل(14)

محولہ بالا اشعار سے اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے مسلسل ہجرتیں کرتا ہے۔ اپنے پیاروں کے بہتر مستقبل کے لیے تو کبھی اپنی خواہشات کے پیچھے سرپٹ بھاگتا ہے۔ عمر بھر یوں ہی دُنیا میں بھٹکتا پھرتا ہے لیکن جس عنقا کی اُسے تلاش ہوتی ہے وہ اُسے کہیں میسر نہیں آتا۔ پل بھر کا سکوں اور چین جب مہیا نہیں ہو پاتا تو طویل مسافت اُسے تھکا دیتی ہے۔

مسلسل ہجرتوں سے چور ہو کر
مسافر راہ میں سونے لگا ہے(15)

ازاں بعد جب انسان نے دیہاتی زندگی کو خیر باد کہہ کر شہر کا بھی تو رُخ کیا ہے۔ اس نقل مکانی سے جو رنج اُٹھائے وہ تو الگ بحث ہے؛ انسان فطرت سے دور ہوتا گیا، جو اُس کی تنہائی اور کئی داخلی بحرانوں کا سبب بنا۔ گاؤں میں لوگوں کا ہجوم اکثر برگد کے پیڑ تلے اکٹھا ہوتا تھا، لیکن آج وہ بھی تنہا لوگوں کا راستہ دیکھ رہا ہے؛ جب کہ بستی تو کب کی ویران ہو چکی ہے۔

جا چکے سارے لوگ بستی سے
گاؤں میں اک بوڑھا برگد ہے(16)

آج کے میٹروپولیٹن شہروں میں انسان سالہا سال قربت کے باوجود ایک دوسرے سے اجنبی ہوتے ہیں۔ جب کہ دیہاتوں، قصبوں اور چھوٹے شہروں کے لوگ اپنے اردگرد کے جزوکل سے واقفِ حال ہوتے ہیں۔ شہروں میں نامیاتی معاشرہ اس قدر انتشار کا شکار ہو چکا ہے کہ ہمسائے بھی سالوں کی قرابت کے باوجود ایک دوسرے سے اجنبی ہوتے ہیں۔ اس کا ادراک ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی شاعری سے خوب لگایا جا سکتا ہے:

سالہا سال قربتوں کے بعد
لوگ اس شہر میں پرائے ہیں(17)

جدید دور میں خارجی دُنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر نامے نے انسان کی داخلی دُنیا کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ آج کا انسان ہجوم میں تنہا ہو گیا ہے۔ اور اس کے درد و کرب میں مسلسل اضافہ ہو تا جا رہا ہے۔ اس پر مستزاد اُسے اپنے غم بھی تنہا جھیلنے پڑ رہے ہیں۔ ازاں بعد جدید دور کا انسان سوچ و فکر میں اگر آزاد ہوا ہے تو اُسے مذہب اور فلسفہ و فکر کی بھی رہنمائی میسر نہیں رہی۔ اس شتر بے مہاری کے عالم میں وہ ہجوم میں بھی تنہا ہو گیا ہے۔ اس کرب میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور انسان اپنی ذات کے اندھیروں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ سائنس نے جہاں ترقی کی منازل طے کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نھیں رکھی، وہیں انسان تنہائی کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن موجودہ انسان کے اس داخلی بحران کو کئی ایک مقام پر نہ صرف نشان زد کرتے ہیں، بل کہ اُن عوامل کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں جو اس داخلی بحران کا اصل سبب ہیں۔

میں آسمان کی وسعتوں کو دیکھتا رہا
ہوتا رہا میں ذات کی تنہائیوں میں گم(18)

ڈوبتے ہیں تیرگی میں گھر بھی قبرستان بھی
اور گلی کے موڑ کا اب لیمپ جلتا ہی نہیں
پھول ہیں اور شہر پیرس اور مئے گلنار بھی
کچھ کمی ہے جس باعث جی بہلتا ہی نہیں(19)

محولہ بالا اشعار سے تنہائی اور وجودی بحران کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی کہیں جی نہیں بہلتا تو مسئلہ داخلی بحران کا ہے نہ کہ خارجی بحرانوں کا، یہی سبب ہے کہ آسمان کی وسعتوں کے باوجود ذاتی گمنامی بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ہو گیا سنسان سارا شہر گھر بھر سو گیا
میری آنکھیں جاگتی ہیں، سارا منظر سو گیا
پھر وہ شہر اجنبی، تنہائیوں کی سرد رات
اوڑھ کر یادوں کی میلی سی چادر سو گیا
رات دن کے درمیان گزری ہے ایسے زندگی
ایک منظر جاگتا تھا، ایک منظر سو گیا(20)

اجنبی شہر، تنہائیوں کی سرد رات، یادوں کی میلی چادر، منظر جاگتا سوتا ہوا، گو کہ سادہ اور عام سی تراکیب معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن غور کریں تو ان تراکیب کی تہہ داری اور زیر لب تنہائی، ذات کا بحران اور سماج کی سرد مہری پر ایک احتجاج ملتا ہے۔ دراصل یہی احتجاج ان کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ جو انھیں جدید شعراء میں منفرد مقام بخشتا ہے۔

جدید دور کے تضادات، منافقت، جھوٹ، تصنع، وجودی بحرانِ، سیاسی و معاشی عدم استحکام، خود غرضی اور مذہبی بیزاری جیسے مسائل سے دوچار انسان عجیب سی کرب ناکی میں مبتلا ہے، ازاں بعد سرمایہ دارانہ نظام، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری، معاشی و معاشرتی استحصال، دُنیا کے وسائل ہتھیانے اور جمہوری آمریتوں سے دوچار انسان بہ ظاہر تو آزاد معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے۔ قدم قدم پر غلامی کے طوقوں میں جکڑے ہوئے انسان کی سوچوں پر پہرے بٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی دانست میں تو آزدانہ فکر کا مالک ہے لیکن حقیقت محض اُس کی خام خیالی پر مبنی ہے گویا آج کے انسان کی سوچ کے گرد ایک یوٹوپیا بنایا ہوا ہے، جس میں وہ مقید ہو چکا ہے۔

اندھیرا چار سُو ہونے لگا ہے
یہ منظر دلکشی کھونے لگا ہے
شکستہ لوگ، بام و در شکستہ
خرابے کا گماں ہونے لگا ہے(21)

اس شہر سے سکوں کے فرشتے بھی اُڑ گیے
کوئی پرندہ شاخِ شجر پر نہیں یہاں(22)

میں ذرا بھی یقیں نہیں رکھتا
شہر کے اب کسی ادارے میں(23)

باہر آ کے مکر گیے سب کچھ
سارے وعدے تھے بند کمروں میں(24)

چھوٹے سے قرض خواہ کا گھر ضبط ہو گیا
مجرم بڑے معاف، سزا بھی معاف ہے(25)

ہم نے لے کر خدا کا نام یہاں
ظلم انسانیت پہ ڈھائے ہیں(26)

محولہ بالا اشعار میں بام ودر کی شکستگی اور سکوں کے فرشتے کا اُڑنا، اس بات پر دال ہے کہ جدید دور میں انسان لاینحل مسائل سے بر سرِ پیکار ہے۔ اس سارے تناظر میں انسانیت پر مظالم ڈھانے کے لیے کبھی مذہب کا سہارا لیا جارہا ہے اور کبھی معاشی پالیسیوں سے اس کی زندگی جہنم بنائی جارہی ہے۔ اس پر دوہرا عذاب شہر کے بڑے بڑے ادارے انسانیت کے مسائل حل کرنے کے بہ جائے اُس کے لیے معاشی و معاشرتی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ جس سے انسانیت سر جھکائے گہرے گڑھوں میں سسک رہی ہے۔

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی شاعری عصری شعور کی حامل اور انسانی مسائل کی آئینہ دار ہے۔ اُن کی شاعری موجودہ دور کے ایک مکمل منظر نامے کی حیثیت رکھتی ہے اور موجودہ سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کی عکاس ہے۔ اُن کی غزل کا مطالعہ کرنے اس بات کا مکمل ادارک ہوتا ہے کہ دور حاضر کا انسان آزاد تو ہے، لیکن اس حد تک کہ گزشتہ صدیوں کی طرح نو آباد کاروں کے ہاتھوں جبر واستبداد کا شکار نہیں ہے۔ موجودہ صدی میں انسان ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھوں یرغمال ہو رہا ہے۔ انھی عالمی سرمایہ داروں اور استعماری قوتوں کی ہوس نے انسانی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ جس سے کسی صورت نظر نہیں چرائی جاسکتی۔ تیسری دُنیا کا انسان آج بھی کس مپرسی کی زندگی گزار رہا ہے، جب کہ عالمی دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک آئی ایم ایف(IMF) اور ورلڈ بنک (World Bank) کے دام میں انھیں خوشحالی کے سبز باغ دکھا کر قرضوں کی دلدل میں دھنساتے جارہے ہیں۔ تیسری دُنیا کے وسائل پر استعماری قوتیں نظریں جمائے بیٹھی ہیں۔ یہی قوتیں تیسری دُنیا کو خیر خواہی اور خوشحالی کے سبز باغ دکھا کر غربت اور افلاس کی جہنم میں جھونک رہی ہیں۔ تیسری دُنیا میں دہشت گردی، تخریب کاری اور بدامنی کے واقعات معمول کے معاملات ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا فائدہ کس کو ہوتا ہے؟ ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو جو اسلحے کا کاروبار کرتی ہیں۔ ان ممالک میں صحت، تعلیم، خوراک اور جان ومال کی حفاظت جیسے بنیادی حقوق سے محروم طبقہ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ جب کہ دہشت گردی کی ہول

ناکیاں اور جنگ و جدل کے خطرات بادل کی طرح سر پر منڈلا رہے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی غزلیات کو اس وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو وہ موجودہ منظر نامے کی بھرپور عکاس ہیں۔ جو اس بات پر دال ہے کہ وہ عالمی منظر نامے سے بہ خوبی واقف ہیں، بل کہ اُس کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔

خالی خدا کے ڈر سے کوئی گھر نہیں یہاں
آفت کی زد سے کوئی باہر نہیں یہاں
بارود کے دھوئیں کی سیاہی ہے دُور تک
اب نیلے آسمان کی چادر نہیں یہاں
سب نے چھپالیا یہاں اپنا اپنا خوف
چہرے سے کوئی حال اُجاگر نہیں یہاں
اس شہر سے سُکوں کے فرشتے بھی اُڑ گیے
کوئی پرندہ شاخِ شجر پر نہیں یہاں(27)

سکون کے فرشتوں کا اُڑنا اس دُنیا کے امن وامان کے ابتر ہونے کی طرف اشارہ ہے اور انتہائی معنی خیز ترکیب ہے۔ اس پوری غزل میں جنگ و جدل اور خوف و ہراس کی کیفیت زیر بحث لائی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی غزلیات اُن مغربی نام نہاد چہروں سے امن و آشتی کا کھٹ اُتار پھینکتی ہے، جو ہر لمحہ غریب پر قرضے اور جنگیں مسلط کر کے انھیں غلام بنا رہے ہیں۔ معاشی حالت روز بروز سقیم ہوتی جا رہی ہے؛ جب کہ جنگ و جدل اور دہشت گردی سے ہزاروں لوگ لقمہ اجل بن رہے ہیں۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سبھی متاثر ہوئے ہیں۔ بھوک، افلاس، وبائی امراض، معاشرتی و معاشی ابتری نیز موسمی سختیاں ان مظلوم و مفلوک الحال لوگوں کی قسمت میں لکھ دی گئی ہیں اور کہیں بہتری کی اُمید نظر نہیں آتی۔ اس سارے تناظر میں عراق، افغانستان، لیبیا، شام اور یمن کی موجودہ صورت حال سامنے کی مثالیں ہیں۔ جہاں لاکھوں لوگ اسلحہ کے سرمایہ کاروں کی ہوس کے باعث بارود کا ایندھن بن چکے ہیں۔ ایسے میں ڈاکٹر سلیم الرحمٰن ایک ہمدرد مسیحا کی طرح امن و آشتی کا پیغام دیتے ہوئے گویا ہوتے ہیں۔

شاخِ زیتون دکھائیں سب کو
امن کا گیت سنائیں سب کو
جنگ کا ڈھول بجانا چھوڑیں
پیار کی لے پر نچائیں سب کو

ہر کوئی فرش نشیں ہو گا یہاں
اُونچی مسند سے اُٹھائیں سب کو
آؤ بارود کی کالک دھولیں
اک نیا چہرہ دکھائیں سب کو(28)

ازاں بعد مذہب کے نام پر جس قدر انسانیت پر ظلم ہوا، وہ کسی بھی مذہب کا بنیادی فلسفہ نہیں ہے، بل کہ یہ سب ذاتی اقتدار اور معاشی مفادات کی بُنیاد پر لڑی جانے والی لڑائیاں تھیں۔ گویا مذہب کی آڑ میں ذاتی مفادات کے حصول نے انسانیت کا قتلِ عام کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کا درج ذیل شعر کسی تازیانے سے کم نہیں:

ہم نے لے کر خدا کا نام یہاں
ظلم انسانیت پہ ڈھائے ہیں(29)

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن نے جہاں جدید دور کے حالات و واقعات میں ہجرت، میٹروپولیٹن زندگی، داخلی بحرانوں اور جنگ و جدل کا واشگاف الفاظ میں اظہار کیا ہے۔ وہیں صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کو بھی قلم زد کیا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ صنعتی انقلاب نے انسانی زندگی میں وسائل کی فراوانی کو یقینی بنایا ہے، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے بہت سے بکھیڑے بھی کھڑے ہوئے ہیں، جدید دور میں وسائل کے استعمال کو بہتر طور استعمال کر کے زندگی کو سہل بنانے میں صنعت کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ نت نئی مشینری کی ایجادات نے انقلاب برپا کر دیا ہے۔ مکینکس، الیکٹرانکس اور سوفٹ ویئر کے آلات نے انسان کو کرشماتی ارتقا مہیا کیا ہے اور اُسے خلاؤں کی تسخیر کے قابل بنا دیا ہے۔ لیکن ان ارتقائی مراحل کے موجب فطرت کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ زمینوں سے زائد پیداوار کی ہوس نے انسان کو مصنوعی کھادیں اور کیمیکلز کے استعمال کی طرف راغب کیا ہے، اس سے نہ صرف فطرت نقصان اُٹھا رہی ہے، بل کہ انسانی زندگی بھی داؤ پر لگ چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسان نت نئی بیماریوں اور وبائی امراض میں جکڑا جا چکا ہے۔ قدرتی غذاؤں کو ترک کرنے کے سبب اُس کا قوت مدافعت کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر مستزاد دھواں اُگلتی کارخانوں کی چمنیوں میں سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا ہے۔ تھرمل انرجی پاور ہاؤسز اور دیگر صنعت نے فضائی آلودگی کو بڑھاوا دیا ہے۔ گلوبل وارمنگ اس کرہ ارض کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکا ہے۔ درختوں کی بے جا کٹائی نے اس سب میں مزید اضافہ کیا ہے۔ گویا

ماحولیاتی آلودگی نے اس کرہ ارض کو کئی خطرات لاحق کر دیے ہیں۔ جس سے نہ صرف انسان بل کہ جنگلی حیات اور آبی حیات بھی متاثر ہو رہی ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر سلیم الرحمٰن جیسا حساس انسان کیسے چپ رہ سکتا ہے۔ وہ ماحولیاتی آلودگی کے عوامل اور خطرات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ جس کا ادراک اُن کے شعری حوالوں سے بہ خوبی ہوتا ہے۔

کالک اُگل رہی ہیں جو دن رات چمنیاں
ہیں اور کیا بگڑتے ہوئے موسموں کے راز(30)
اک بار یہاں بویا گیا زہر زمیں میں
بدزائقہ اب ہر نئے موسم کا ثمر ہے(31)

دیکھیے کیسی فصل اُگتی ہے
بیج بوئے ہیں ہم نے زہر کے ساتھ(32)

کیا کیا نہ ظلم ہم نے کیے اس زمیں پر
کیا کیا نہ زہر اُگایا گیا ہر کلی کے ساتھ(33)

جس جگہ پیڑ تھے، پرندے تھے
بن گیے ہیں بدنما گھر کیا کیا(34)

سمندر میں سیاہی گھل رہی ہے
جزیرے رنگ کے ہیں آسماں پر(35)

محولہ بالا اشعار کی بُنت اس بات کا مظہر ہے کہ انھوں نے ماحولیاتی آلودگی کے نہ صرف عوامل کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے، بل کہ اُن پیچیدگیوں سے بھی مکمل آگاہ ہیں۔ جو اس صورت حال کے محرک ہیں۔ کالک اُگلتی چمنیاں، فرٹیلائزرز اور کیڑے تلف کرنے والی ادویات نیز پیڑوں کی کٹائی ماحولیاتی آلودگی میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ گویا پورا ایکو سسٹم تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ حشرات الارض، جانور، انسان اور آبی حیات ہر ایک اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔

جنگلات کی کٹائی کا بڑا سبب آبادی میں اضافہ بھی ہے۔ نئے شہروں اور قصباتی آبادیوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ شہری زندگی بہ ذات خود انسانی بقا میں حائل ہو رہی ہے۔ شہری زندگی اگرچہ انسان کے دکھ درد کا درماں بھی ہے؛ لیکن اس کے مسائل بھی لاتعداد ہیں شہروں کے باطنی تضادات سے لے کر نسلی تضادات تک انسان کو داخلی اور خارجی بحرانوں کا سامنا ہوتا ہے

حواشی و حوالہ جات

1۔ ارمان نجمی، لامکانی سے نبرد آزما تغزل، دیباچہ "مسافرت کا چاند"، مجموعہ، سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، لاہور: کلاسیک، 2011ء، ص:16
2۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، سلیم الرحمٰن کی نظمیں، مشمولہ: منظر جاگتا سوتا ہوا، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، 2007ء، ص:174
3۔ مسافرت کا چاند، ص:157
4۔ ایضاً، ص:35
5۔ ایضاً، ص:61
6۔ ایضاً، ص:44
7۔ ایضاً، ص:64
8۔ ایضاً، ص:116
9۔ ارمان نجمی، لامکانی سے نبرد آزما تغزل، دیباچہ: مسافرت کا چاند، ص:20-21
10۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تشکیل جدید، کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 2016ء، ص:133
11۔ ارمان نجمی، لامکانی سے نبرد آزما تغزل، دیباچہ: مسافرت کا چاند، ص:21
12۔ سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، مسافرت کا چاند، ص:42
13۔ ایضاً، ص:46
14۔ ایضاً، ص:98
15۔ ایضاً، ص:41
16۔ ایضاً، ص:112
17۔ ایضاً، ص:161
18۔ ایضاً، ص:59
19۔ ایضاً، ص:58

20۔ ایضاً، ص:131

21۔ ایضاً، ص:41

22۔ ایضاً، ص:80

23۔ ایضاً، ص:95

24۔ ایضاً، ص:97

25۔ ایضاً، ص:105

26۔ ایضاً، ص:160

27۔ ایضاً، ص:80۔81

28۔ ایضاً، ص:156

29۔ ایضاً، ص:160

30۔ ایضاً، ص:118

31۔ ایضاً، ص:130

32۔ ایضاً، ص:55

33۔ ایضاً، ص:71

34۔ ایضاً، ص:137

35۔ ایضاً، ص:139